بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

محرم الحرام ۱۳۹۴ھ کے اختتام اور صفر المظفر کے آغاز کے دو چار دن نہ صرف پاکستان کے لیے بلکہ پوری دنیائے اسلام کے لیے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان ایام میں دو ایسے واقعات رونما ہوئے جن میں سے ایک کو نرم ترین الفاظ میں ملتِ اسلامیہ کی تاریخ کے سیاہ باب کا نہایت ہی اندوہناک عنوان کہا جا سکتا ہے، یا ایک ایسا المناک حزنیہ جس نے ہر شعور و احساس رکھنے والے مسلمان کو شدید کرب و اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ اپنے آپ کو ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گم پاتا ہے جس میں دور دراز تک اُسے روشنی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی افسردگی اور بے بسی کا اندازہ اقتدار کے نشے میں بدمست مگر عوام کی جھوٹی محبت کا دم بھرنے والے افراد نہیں کر سکتے۔ اُن کے غم و اندوہ کو کچھ وہی لوگ جان سکتے ہیں جنھوں نے وزیر اعظم بھٹو کی زبان سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے منحوس اعلان کو عوام پر برق بن کر گرتے دیکھا۔ ہم اس ضمن میں کچھ کہنے سے قاصر ہیں کہ عوام کی نبضوں پر ہاتھ رکھنے والے اس صاحبِ اقتدار کو عوام کے ردعمل کا صحیح احساس ہے یا نہیں لیکن ایک بات ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح فیلڈ مارشل محمد ایوب کے لیے معاہدۂ تاشقند، ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کی ظفرمندی کے باوجود، اس کے زوال کا باعث بنا، بالکل اسی طرح بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا وزیر اعظم بھٹو کے لیے نقطۂ انحطاط ثابت ہو گا۔

ہم نہیں جانتے کہ مسٹر بھٹو کسی خوش فہمی کی بنا پر یا تجاہلِ عارفانہ کے تحت اس عظیم حادثہ کو ملک کے حق میں نیک فال قرار دے رہے ہیں مگر انھیں اس بات کو بخوبی جان لینا چاہیے کہ چند مفاد پرست لوگوں کے بیانات خواہ وہ گھر کے ہوں یا باہر کے، تلخ حقائق کو خوش کُن حالات میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ جہاں تک گھر کے مفاد پرستوں کا تعلق ہے گزشتہ ۲۵ سال میں ضمیر فروشی کی تربیت نے انھیں دُنیوی مفادات کا اس حد تک پرستار بنا دیا ہے کہ بنگلہ دیش کے معاملے میں وزیر اعظم کی تائید و حمایت تو ایک طرف رہی اگر وہ پورا ملک بھی کسی سامراجی قوت کے سامنے بطور تحفہ پیش کر دیں تو یہ لوگ صاحبِ اقتدار کے اس اقدام کو بھی اس وقت تک سراہتے رہیں گے جب تک کہ وہ مسندِ اقتدار پر فائز ہیں۔ لیکن جس وقت وہ اس سے محروم ہوں گے اور

اُن کی جگہ کوئی دوسرا اس پر قابض ہوگا تو پھر یہ نئے مقتدر کے ہر اقدام کی تعریف و توصیف شروع کر دیں گے اور سابق حکمران کے ہر کام کو ملک و ملت سے غداری پر محمول کریں گے۔ اِس لیے ان ضمیر فروشوں کے ستائشی کلمات سے وزیر اعظم صاحب کو خوش نہ ہونا چاہیے۔ یہ لوگ تو ہر اُس شخص کے ثناخواں ہیں جس کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار ہوتی ہے اور ہر اس شخص سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں جو اقتدار سے محروم ہو جاتا ہے۔

اقتدار کے ان پجاریوں کے علاوہ مسٹر بھٹو کو ان اسلام دشمن عناصر کی تائید سے بھی خوش نہ ہونا چاہیے جو اس خطہ پاک کی دینی حیثیت کو مٹانے کے درپے ہیں اور جنہیں یہ تصور بھی شاق گزرتا ہے کہ یہاں اسلام کا بول بالا ہو۔ انہیں اشتراکیت کی سربلندی مطلوب ہے اور اسی کی خاطر وہ ہر اس اقدام کی تائید پر آمادہ رہتے ہیں جس سے اِسلام کی بجائے کفر کی راہ ہموار ہوتی ہو۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے چونکہ دین کی اساس پر قائم ہونے والے تصورِ ملت کو شدید دھچکا لگا ہے اور بقول اندرا گاندھی اُس نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ مذہب انسانیت کے کسی گروہ کے مابین رشتہ اخوت قائم کرنے میں ناکام رہا ہے“ اس لیے اشتراکیت کے مُبلغ اور حامی اور دوسرے لادین عناصر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے پر خوشی کے شادیانے بجا رہے ہیں۔

وزیر اعظم بھٹو کے فیصلے پر مسرت کا اظہار ایک ایسا طبقہ بھی کرتا ہُوا نظر آتا ہے جس کی تائید سے انہیں اطمینان خاطر حاصل ہونے کے بجائے پریشان ہونا چاہیے کہ اُن کی حمایت ایسے گھٹیا لوگ کر رہے ہیں جن کی سوچ کی حدِ کمال یہ ہے کہ اس معاہدے سے بھارت کے ساتھ تعلقات بحال کرنے میں مدد ملے گی اور بالآخر اُن کے لیے بھارتی فلمیں دیکھنے کے مواقع فراہم ہوں گے۔ جن لوگوں کی فکر اتنی پست ہو اُن کی کسی مسئلہ کے بارے میں تائید و حمایت قومی زندگی میں آخر کیا اہمیت رکھتی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ وزیر اعظم بھٹو اس وقت جن لوگوں میں گھرے ہوئے ہیں وہ انہیں اصل حقائق سے کبھی بھی آگاہ نہ ہونے دیں گے اور انہیں یہی باور کراتے رہیں گے کہ اُنہوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے قوم پر جو عظیم احسان کیا ہے پوری قوم اس کے لیے ان کی شکر گزار ہے اور اُن کے اس سُنہری کارنامے پر انہیں ہدیۂ تبریک پیش کر رہی ہے۔ لیکن اگر وہ ان خوشامدیوں کے نرغے سے کبھی باہر نکل کر لوگوں کے ردِّ عمل کا جائزہ لیں تو اُن پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جائے گی کہ قوم کی عظیم اکثریت اُن کے اس فیصلے کو دل کی گہرائیوں سے غلط اور سخت عاقبت نا اندیشانہ سمجھتی ہے جس نے ان کے وقار کو مجروح کر دیا ہے۔ قوم اس وقت اگر خاموش اور مُہر بلب ہے تو اس سے اُنہیں یہ نتیجہ نہ اخذ کر لینا چاہیے کہ یہاں سب اچھا ہے“ اور قوم نے اُن کے فہم و تدبّر پر بھروسہ کرتے ہوئے اُن کے اس فیصلے کی توثیق کر دی ہے اور اُسے اُن کی اِس بات کا پورا یقین ہو چکا ہے کہ

تاریخ اس فیصلے کی صحت پر اپنی تصدیق ثبت کر دے گی۔ وہ غالباً اس حقیقت سے ناواقف نہیں کہ بے کسی، مجبوری اور بیچارگی کا سکوت اپنی آستینوں میں بہت سے طوفان چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔

خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

پھر تاریخ کو جو آپ نے اس معاملے میں بار بار حَکَم ٹھہرایا ہے اور حقیقت کو ماننے پر اصرار کیا ہے اس کے بارے میں بھی آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ اس ملک کا باشعور طبقہ اس کی لِم سے ناآشنا ہے اور آپ حقیقت پسندی کے نام پر ان کے ذہنی اضطراب اور خلجان کو طمانیت سے بدلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اہلِ پاکستان کی اکثریت نہ سہی مگر ایک اچھی خاصی تعداد "حقیقت پسندی" کے اس فلسفے کے پس منظر، اس کے مُضمرات اور نتائج سے بخوبی واقف ہے۔ اسے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ کس طرح ہیگل کے اس نظریے نے کہ جو موجود ہے وہی حقیقت ہے اور جو حقیقت ہے وہ صحیح ہے یا دوسرے لفظوں میں جو موجود ہے وہی صحیح ہے، اہلِ یورپ کو زندگی کی اعلیٰ اور ارفع اقدار سے محروم کر کے انہیں پست صورتِ حال سے مصالحانہ رویہ اختیار کرنے والا اور ہر قسم کے ظلم و استبداد، بُرائی اور ذلت کے سامنے سرنگوں ہونے والا بنا دیا۔ ہیگل نے تو یہ فلسفہ آمریت کے فروغ اور کشمکشِ حیات میں ہر جائز و ناجائز حربے کے استعمال کے جواز کے لیے گھڑا تھا۔ مارکس نے اس فلسفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اشتراکیت کے علمبرداروں کو اس بات کی تربیت دی کہ انہیں ہر قسم کے اخلاقی اور غیر اخلاقی ہتھکنڈے استعمال کر کے کسی طرح تختِ اقتدار پر قبضہ کرنے کی فکر کرنی چاہیے، کیونکہ ان کا اقتدار پر تسلط ہی ان کے صحیح اور برحق ہونے کی واضح دلیل ہے اور عوام کے اندر حقیقت پسندی کے اس فلسفے کا اس لیے پرچار کیا گیا کہ وہ جور و جفا کو حقیقت مان کر اس پر راضی ہو جائیں۔ اگر حقیقت پسندی کے فلسفے کے مُضمرات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ ہر فرد اور گروہ اور طبقے اور معاشرے کے لیے اس کے مخصوص حالات کے پس منظر میں الگ الگ مفہوم اور معانی رکھتا ہے۔ جباروں، سفاکوں، ظالموں اور زبردست آزاروں کو اپنی ظالمانہ کارروائیوں کے لیے اس سے سندِ جواز فراہم ہوتی ہے اور کمزوروں، بے بسوں اور مجبوروں کو ظلم و استبداد کے مقابلے میں اعترافِ شکست کی تربیت ملتی ہے۔

حقیقت پسندی کے اس سارے فلسفے میں سب سے بڑا منطقی مغالطہ یہ ہے کہ جو کچھ معرضِ وجود میں آ جائے اُسے صحیح اور برحق تسلیم کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ اگر ایک واقعہ ہو گیا ہے تو وہ بلاشبہ حقیقت ہے لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اس حقیقت کو صحیح اور برحق بھی مان لیا جائے۔ مثال کے طور پر اگر ایک قاتل کسی بے گناہ انسان کو قتل کر دیتا ہے تو یہ حقیقت تو ضرور ہے لیکن کیا اس حقیقت کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ قاتل نے مقتول کو بڑی کامیابی کے ساتھ قتل کیا ہے، اس لیے اس کا یہ فعل صحیح اور درست بھی ہے اور

ہم سب پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اس کی صحت کا اعتراف کریں۔ اصل چیز حقائق کا اعتراف نہیں بلکہ اُن حقائق کے صحیح اور غلط ہونے کا شعور اور اُن کے بارے میں صحیح ردِ عمل کا ہے۔ مثلاً چند بدقماش افراد کسی غریب شخص کی بچی کو بالجبر اغوا کر لیتے ہیں۔ اب وہ بے کس شخص اس حقیقت کا کس طرح سامنا کرتا ہے اس کا سارا دار و مدار اس طرزِ عمل پر ہے جو وہ اس ظلم کے خلاف اختیار کرتا ہے۔ ایک طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ قانون کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، آبادی کے شرفاء کے احساسِ شرافت کو ابھارتا ہے، اپنے اقربا کی غیرت کو بیدار کرتا ہے، جن جن افراد اور حلقوں کے بارے میں اُسے پتہ چلتا ہے کہ وہ مجرموں پر کسی قسم کا دباؤ ڈال کر اس کی مظلوم بچی کی بازیابی میں کسی طرح مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں، ان کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس وقت تک دم نہیں لیتا جب تک وہ اس مظلومہ کو ان کے چُنگل سے نجات نہیں دلا لیتا اور اس مقصد کے لیے وہ جان و مال ہر چیز کو قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دُوسرا شخص اس اندوہناک تلخ حقیقت کا اعتراف کہ اس کی بچی کو چند بدمعاشوں نے اغوا کر لیا ہے، اس طرح کرتا ہے کہ بچی کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے اور صرف اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ جس شخص کے گھر میں وہ محبوس ہے اُسے داماد کے طور پر تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور پھر اس کے ساتھ اسی طرح کے راہ و رسم بڑھانے کے لیے کوشاں رہتا ہے جس طرح کہ داماد اور اس کے دوسرے اقارب کے ساتھ بڑھائے جاتے ہیں۔ یہ بھی اعترافِ حقیقت ہی کی ایک صورت ہے لیکن دونوں صورتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلی صورت میں اعترافِ حقیقت نے ایک غیور شخص کی غیرت کو اُبھارا اور اس کے دل میں ظلم کے خلاف شدید ردِ عمل پیدا کیا اور دوسرے شخص نے حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے غیرت کو تیاگ دیا، اور ظالم کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہوا۔

جن باتوں کو ہم حقائق کہہ کر ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی تلقین کرتے ہیں وہ فطرت کے کوئی ایسے لگے بندھے ضابطے نہیں ہوتے جنہیں تبدیل نہ کیا جا سکے۔ یہ معاشرتی حقائق انسان کی قوتِ عمل سے بدلتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر سورج کا ایک خاص سمت میں سفر ایک ایسی حقیقت ہے جس میں انسان کوئی تغیر و تبدّل نہیں کر سکتا مگر تاریخ کے رُخ کو اپنی ہمت سے جدھر چاہتا ہے موڑ لیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ ایک حقیقت تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ میں بے بس تھے اور کفارِ مکّہ ان کے مقابلے میں طاقتور تھے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اس حقیقت کے باوجود حضورؐ نے کفر کو ایک بالاتر قوت کے طور پر کبھی تسلیم نہ کیا اور وہ خود اور ان کے رفقاء کار اس یقین کے ساتھ جد و جہد کرتے رہے کہ حق کو بہرحال غالب ہونا اور باطل کو مٹنا ہی ہے۔ اسی طرح سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اوّل سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے فتنۂ مانعین زکوٰۃ اور فتنۂ ارتداد خوفناک حقائق کی صورت میں نمودار ہوئے مگر انہوں نے ان کے ساتھ کوئی مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے ان کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیابی عطا کی اور کفر کی یلغار کے یہی ٹھوس حقائق خواب

پریشاں کی طرح منتشر ہو کر رہ گئے۔

معاشرتی حقائق کا چونکہ اخلاق سے گہرا تعلق ہوتا ہے اس لیے اخلاق کی معمولی حس رکھنے والے افراد اور قومیں ان حقائق کو اسی وقت تسلیم کرتی ہیں جب اُن کی نگاہ میں اُن کے وجود کا کوئی اخلاقی جواز بھی ہو۔ کشمیر ربع صدی سے بھارت کے قبضے میں ہے اور یہ ایک حقیقت ہے لیکن پاکستان اس حقیقت کو اس لیے تسلیم نہیں کرتا کہ بھارت کا اس خطے پر قبضہ عدل و انصاف کے سراسر منافی ہے۔ جس اصول پر ملک کی تقسیم ہوئی تھی اس کی رو سے مسلم اکثریت کے اس علاقے کو پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہیے تھا۔ بھارت نے ننگی جارحیت کا مظاہرہ کرتے اور عدل و انصاف کے سارے ضابطوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے پاکستان کے اس حصے پر بالکل ناجائز طور پر قبضہ کر لیا۔ اب اگر ہمیں کوئی یہ کہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لو تو اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ وہ ہمیں یہ درس دے رہا ہے کہ تم بھارت کی جارحیت اور اس کے اس ناجائز قبضہ کو برحق مان لو۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اتحادیوں نے جرمنی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصے پر روس قابض ہو گیا اور دوسرا حصہ امریکہ نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس ملک کی دو حصوں میں تقسیم بالکل حقیقت ہے جس پر ساری دُنیا گواہ ہے مگر گزشتہ تیس سال سے المانیہ کے باشندے اِس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہے کیونکہ وہ اس تقسیم کو غلط اور جارح اقوام کے اس فیصلے کو ناانصافی پر مبنی سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کی ایک نہیں متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان کے تخلیق کردہ حقائق کا اعتراف اسی وقت کیا جاتا ہے جب وہ اخلاقی اعتبار سے تسلیم کرنے کے قابل ہوں اور اگر اس نقطہ نظر سے وہ صحیح نہ ہوں تو انہیں پوری قوت کے ساتھ مسترد کر دیا جاتا ہے۔

بھٹو صاحب نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں تاریخ کے فیصلے کا ذکر فرماتے ہوئے کہا ہے کہ اگر یہ فیصلہ غلط ہُوا ہے تو مستقبل اسے غلط قرار دے کر مٹا دے گا اور اگر یہ صحیح ہُوا ہے تو مستقبل اس کی صحت کی تصدیق کر دے گا۔ تاریخ کا فیصلہ بلاشُبہ بڑی قدر و قیمت کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن وزیر اعظم کو اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ تاریخ کے جس فیصلے کا وہ ذکر فرما رہے ہیں یہ وہ فیصلہ نہیں جس کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں انسانی فہم کچھ سوچنے سے قاصر ہے۔ پھر یہ کسی فرد کی کوئی ذاتی رائے بھی نہیں جس کی صحت کی تصدیق بغیر کسی بہت بڑی قربانی کے آسانی کے ساتھ کی جا سکے۔ معلوم نہیں کہ انہیں اس بات کا احساس ہے یا نہیں کہ وہ اپنے جس اقدام کے بارے میں تاریخ کے فیصلے کے طلبگار ہیں اس کا تعلق ان کی ذات سے کہیں زیادہ اُن کی قوم بلکہ پوری ملت اِسلامیہ سے ہے اور جس چیز کو وہ تاریخ کے فیصلے کا نام دے رہے ہیں وہ درحقیقت وہ انجام ہے جس پر وہ قوم کو پہنچا

کہ اس کا حشر دیکھنا چاہتے ہیں۔ دُنیا کا کوئی حسّاس اور صاحب بصیرت شخص اپنے آپ کو یا اپنے اہل وعیال کو انجام کے سپُرد کرکے اپنے کسی فعل کے نتائج دیکھنے پر تیار نہیں ہو سکتا۔ کیا کوئی دانشمند شخص اس بات کو گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے لختِ جگر کو آگ میں جھونک کر یا اُسے بُری صحبت میں گرفتار کرکے اس کے بھیانک انجام سے اُسے آگاہ کرے۔ دردمند لوگ تو ان افراد کو بھی حوادث کی اُن بے مروت لہروں کے سپرد کرنا گوارا نہیں کرتے جو اُنہیں خوفناک انجام سے دوچار کر دیں۔ وہ انہیں اُن کی دستبرد سے بچانے کی پُوری کوشش کرتے ہیں۔ کُجا آپ کہ اپنی قوم کو حوادث کے تھپیڑوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر انہیں انجام سے آگاہ کرنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔

قرآن مجید نے نوعِ انسان کو گزرے ہوئے حالات وواقعات سے عبرت پکڑنے کی جو بار بار تلقین کی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نوعِ بشری انسان کی غلط روش خصوصاً جب کہ یہ روش اجتماعی معاملات میں ہو، کی تباہ کاریوں کی تاب لانے کی ہمت نہیں رکھتی اس لیے اِسے اس خطرناک راہ سے بار بار گزرنے سے متنبہ کیا جاتا ہے اور اُسے یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اُن کے انجام کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ان خوفناک راہوں سے بچانے کی فکر کرے۔ انسان تو کسی بے جان شے پر ایک تجربہ گاہ کے اندر بھی کوئی خوفناک تجربہ کرتے ہوئے سخت خوف محسوس کرتا ہے وہ آخر ذی روح انسانوں کی زندگی کے ساتھ وسیع تر انسانی برادری کے دائرے میں آگ کا کھیل کھیلنا کس طرح گوارا کر سکتا ہے۔ جب کہ اُسے ماضی کے واقعات صاف طور پر بتا رہے ہوں کہ اس خطرناک کھیل سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

پاکستان میں ہم اس قسم کے تجربات بار بار کرکے ان کا بھیانک انجام دیکھ چکے ہیں۔ مرحوم لیاقت علی خاں نے یو۔ این۔ او کے کہنے پر کشمیر میں فائر بندی کا جو اقدام کیا اس کے نتائج قوم آج تک بھگت رہی ہے۔ ملک غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کا جو فیصلہ کیا اس سے ان کی ذات کو تو اس کے علاوہ اور کوئی نقصان نہ پہنچا کہ مہذب دُنیا میں ان کی رسوائی ہوئی مگر قوم آمریت کی زنجیروں میں جکڑی گئی۔ فیلڈ مارشل ایوب صاحب نے مارشل لا نافذ کرکے اپنی دانست میں اصلاحِ احوال کا ایک نیا راستہ تلاش کیا۔ مگر تین چار سال کے تجربات نے ہی انہیں اس راہ کی تباہ کاریوں سے روشناس کرا دیا، چنانچہ وہ خود تو ہر چیز چھوڑ چھاڑ کر آرام سے ایک طرف بیٹھ گئے اور آمریت کی تباہ کاریوں کی لپیٹ میں قوم آگئی۔

بالکل یہی حال بھٹو صاحب کے اس فیصلے کا ہے جس کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں وہ عوام کو تاریخ کی عدالت کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ کیا انہیں یہ معلوم نہیں کہ تاریخ اپنا فیصلہ اس وقت تک محفوظ رکھتی ہے جب تک کہ کوئی قوم اپنے کیے کا انجام خود اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں لیتی۔ جس طرح لیاقت علی خاں کے اقدام، غلام محمد کے اقدام،

جسٹس محمد منیر کے اقدام، فیلڈ مارشل ایوب صاحب کے اقدام، اور خود اُن کے اپنے اس اقدام کہ انہوں نے اکثریتی پارٹی کے حکومت کرنے کے حق کو تسلیم نہ کیا، کے ہولناک نتائج سے خود تو محفوظ رہے مگر ان کی ہولناکیوں سے قوم بچ نہ سکی۔ بالکل اسی طرح بھٹو صاحب بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے یا دوسرے لفظوں میں بھارت کی اندھی بہری جارحیت کو اخلاقی جواز فراہم کرنے کے انجام سے خود تو محفوظ و مامون رہیں گے۔ لیکن اس غلطی کا خمیازہ ان لوگوں کو بھگتنا پڑے گا جس کا اس فیصلے میں قطعاً کوئی ہاتھ نہ ہو گا۔ آخر یہ کس قدر ناانصافی ہے کہ قوم کا کوئی سربراہ اپنے ذاتی مصالح اور رجحانات کے پیش نظر ایک فیصلہ کرے اور پھر قوم سے یہ کہے کہ تم اس کی تباہ کاریوں کا سامنا کرو۔

گزشتہ ۲۵ سالوں میں ہمارے سربراہوں نے وہ کونسا ایسا فیصلہ کیا ہے جس کے نتائج اس ملک کے سنجیدہ طبقوں کے خدشات کے برعکس رونما ہوئے ہیں۔ اس ملک کی عظیم اکثریت حکمرانوں کو بار بار اس بات کی طرف متوجہ کرتی رہی ہے کہ اسلام کے بغیر اس ملک کا بقا ناممکن ہے اس لیے اللہ کا جو دین ہماری قومی زندگی کے لیے شاہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے معاملے میں خلوص اور سنجیدگی کا رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے مگر ہمارے حکمرانوں نے اس صحیح مشورے کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہ دی اور اسلام کا نام لے کر غیر اسلامی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے جس رشتے نے یہاں کے مائل بہ انتشار اجزا کو ایک دوسرے سے وابستہ کر رکھا تھا وہ کمزور ہوتا گیا اور پاکستانی قوم چھوٹی چھوٹی قومیتوں میں بٹنے لگی اور اُن میں سے ہر ایک نے علیحدگی کا مطالبہ شروع کیا۔ مشرقی پاکستان بھی اس رشتے کے مضمحل ہونے کی وجہ سے بنگلہ دیش کے نام پر ایک لادینی ریاست میں تبدیل ہو گیا۔

پاکستان کی تاریخ کا جائزہ لے کر دیکھیے کہ کیا کسی ایک مرحلے پر بھی قوم کے بہی خواہوں نے حکمرانوں کو اُن کے غلط اقدام پر متنبہ کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے غلام محمد کو بروقت متنبہ کیا، فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب کو مختلف مراحل پر بڑی دلسوزی کے ساتھ اُن کے بعض فیصلوں کی غلطی دلائل کے ساتھ ان پر واضح کرنے کی کوشش کی، سہروردی اور سکندر مرزا کے مخلوط انتخاب کے معاملے میں بے جا اصرار کے نتائج سے پُوری قوم کو روشناس کیا۔ پھر شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکاتی پروگرام، صدر یحییٰ کی پے در پے حماقتوں اور بھٹو صاحب کی اُدھر تُم اور اِدھر ہم کی رٹ کے خطرناک عواقب کی نہایت واضح الفاظ میں نشان دہی کی مگر افسوس کہ حکمرانوں نے ان کی ایک نہ سُنی اور قوم کو تباہی کے راستے پر مسلسل آگے بڑھاتے گئے۔

ہم سقوطِ ڈھاکہ سے لے کر آج تک یہ بات برابر کہہ رہے ہیں کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا ایک عاقبت نااندیشانہ فیصلہ ہے اور آج پھر کسی فرد یا گروہ کی دشمنی میں نہیں، کسی سطحی جذباتیت کے زیر اثر نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ وزیر اعظم بھٹو نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے سخت غلطی کا ارتکاب کیا۔ (باقی صفحہ ۳۰۲ پر)